عشق تماشا

شہناز مزمل

ندا

عشق تماشا

شہناز مزمّل

ندا

☐ اہتمام: محمد احسن تہامی

☐ مطبع: پرنٹ یارڈ

☐ طبع اول: 2002

☐ تعداد: 500

☐ قیمت: 120روپے

ندا پبلی کیشنز

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار

لاہور-54000 فون:7231119

فہرست

درد ہے عشق کی معراج تو ڈرنا کیسا
آبلے پھوڑ کے رفتار سفر دیکھتے ہیں

عشق تماشا

معروف شاعرہ شہناز مزمل کا شعری مجموعہ عنقریب منظر عام پر آرہا ہے ان کے گذشتہ مجموعہ ہائے شعری پر میں نے ایک مفصل تبصرہ لکھا تھا۔ سوچا کہ اس شعری مجموعہ پر بھی کچھ لکھا جائے جو پچھلے مضمون سے پیوست ہو مگر ضمیمہ کی شکل میں ہو کیونکہ کئی سال پہلے لکھے گئے مضمون کے ساتھ تسلسل کی صورت ممکن نہیں جبکہ اس مجموعہ بعنوان ''عشق تماشا'' کا احاطہ بھی اسی سلسلے میں کرنا مقصود ہے۔ ''عشق تماشا'' نظموں، غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ بڑا حصہ غزلوں کا ہے پھر نظمیں باقی گذشتہ مجموعوں میں شہناز زیادہ تر نظموں میں ابھرتی دکھائی دیتی ہیں مگر اس مجموعہ میں غزل سرا کی حیثیت سے نمایاں ہیں۔ تاہم پہلے ایک نظر نظموں پر ڈالتے ہیں۔ تمام نظمیں آزاد ہیں چھوٹی نظمیں بڑی خوبصورتی میں خیال اور فن کے لحاظ سے مکمل ہیں۔

انساں اپنے عکس کی خاطر
اپنے ہاتھوں لٹ جاتا ہے (عکس کی خاطر)

منڈیریں یاد کی سونی پڑی ہیں
ستارے آنکھ میں ٹھہرے ہوئے ہیں (انا کی چیخ)
شفق آلود شامیں مضطرب ہیں
چراغاں کب شبِ ہجراں میں ہوگا

مقابلتاً یہ نظمیں آزاد شکل میں چھوٹے چھوٹے مصرعوں پر مشتمل ہیں اور نازک خیالی کی عکاس ہیں امیجز کے ذریعہ اچھی تصویر کشی ہے۔ نظم ''چلتی پھرتی لاش'' میں عورت کی جملہ کیفیات اور حساسیت کو پیش کیا گیا ہے جو بڑے دلدوز انداز میں ہے مگر نوعیت فکر ہمہ گیر صداقت کی حامل ہیں اس کا اطلاق عمومی ہوسکتا ہے چنانچہ یہ شاعرانہ کاوش سے زیادہ نہیں مگر نظم اپنی جگہ ہر کیفیت سے معمور ہے۔ نظم ''خود ساختہ اندھا نگر'' **Down trodden** طبقے کی بھرپور اور پرزور نمائندگی کرتی ہے اکثریت کا تعلق اس طبقے سے ہے اور ان کی حمایت میں یہ نظم ایک ہمہ گیر اور پر اثر اظہار ہے مختلف کیفیات کو نوع بہ نوع الفاظ دلکش شعری انداز میں پیش کیا گیا ہے دراصل یہ طبقاتی استحصال ہے اور آویزش کے بغیر اس کا حل نہیں وسائل جب سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کے قبضہ میں چلے جائیں تو پھر اندھا نگر طبقاتی جبریت کا شکار ہے اس کا تیرہ و تار ہونا خود ساختہ نہیں بلکہ بصورت جبر و استحصال ہے۔

عشق تماشا کی روح حصہ غزل ہے یہاں غزلیات شہناز کا خاص میدان ہیں وہ اچھی غزل گو ہیں اور اس مجموعہ میں وہ نوع بہ نوع خیالات طرفہ بیانی اور ندرت اظہار کے ساتھ ابھری ہیں۔

شہناز مدت سے تلاش حقیقت میں سرگرداں ہیں اور حضوری کی طلب گار ہیں اور انھوں نے ''ادب سرائے'' میں پڑھے گئے ایک مضمون میں اس کا اظہار بھی کیا تھا وہ اب تصوف کی راہ پر گامزن ہیں اسلوک کی منازل کی سخت کوشی اور دیریابی سے بچتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے رہِ قلندری اختیار کی ہے عراقی کا ایک مشہور شعر ہے۔

صنما رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور بینم رہ و رسم آشنائی

اُن کے اشعار اس انداز فکر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور ''عشق تماشا'' ان کی نئی جہتِ شعری سے روشناس کراتے ہیں۔

اپنے آپ میں کھونے دے اب
عشق تماشا ہونے دے اب

تلاشِ فصلِ گل میں پتیاں سب نوچ ڈالی ہیں
ہوا میں سب ہی کچھ تحریر ہے پر ہاتھ خالی ہیں

میں تھی بجھے دیئے کی طرح طاق میں سجی
پہچان ہوگئی تو مجھے روشنی ملی

عرفانِ ذات نے مجھے حیران کردیا
دوڑا رہا ہے مجھ کو میرا ذوق آگہی

وہ حقیقت شناسی تک پہنچنے کے لئے منازلِ طریقت طے کررہی ہیں چند اشعار:-

بس ایک نقشِ پا پہ ہوئی خم جبینِ شوق
پھر اُس کے بعد نقش تمنا مٹا دیا

چُھپایا تُو نے جمال و جلال پردے میں
جمال ڈھونڈنے والا کمال میں نے کیا

مرے عشقِ خام کو نام دے مری کاوشوں کو دوام دے
مجھے منزلوں کے قریب کر ہوں مسافتیں مری مختصر

ہر اک منظر میں خود کو ڈھونڈتا ہے
ترا عاشق تماشا بن گیا ہے

نوشتہ روز ازل سے ہے لوح پر محفوظ
دکھائی دیتی ہے دنیا سراب کی صورت

سوچتے ہیں یہ کیا کیا ہم نے
نقش اپنا مٹا دیا ہم نے

شہناز کے متصوفانہ اندازِ شعری کے حوالے سے بات ذرا طویل ہوگی کیونکہ اُن کے ہاں یہ رجحان بالخصوص اُبھر رہا ہے علاوہ ازیں ان کی بیشتر غزلیں غزل کے تمام محاصل اور موضوعات سے معمور ہیں تمام غزلوں میں شعری جمالیات تشبیہہ استعار مجاز مرسل صنائع بدائع بخوبی موجود ہیں مختصر تبصرہ میں ان کے حوالے سے بات مشکل ہے ہاں کیفیات کے لحاظ سے بات آگے بڑھائی جاسکتی ہے۔

شہناز کے ہاں تنہائی ہجر کربنا کی ویرانی اُداسی نا اُمیدی کچھ حاصل کرنے کے عزم کے ساتھ عام طور پر دل گداز کیفیت نظر آتی ہے ان موضوعات پر اشعار بڑے اثر انگیز ہیں اور بالعموم تغزل سے متصف ہیں کیفیت قلب ونظر کے ساتھ ساتھ سوز وگداز کا انداز دیکھئے۔

ہر اک بستی ہے اب صحرا کی صورت
مجھے کس نے اکیلا کردیا ہے

شب ہجراں شب قُربت بنا دے
چراغ نیم شب بجھنے لگا ہے

اک سرد سیاہ رات بچھڑنے کا وہ منظر
جینے نہیں دیتا مجھے مرنے نہیں دیتا

کوئی آہٹ ہو لمحے جاگ اُٹھیں
خموشی جان لیوا ہوگئی ہے

بظاہر ہوں میں اک ناچیز قطرہ
مرے اندر سمندر بولتا ہے

ارادہ کیا تھا مسافر کا کچھ نہیں معلوم
سفر پہ جانے سے پہلے مجھے ملا بھی نہیں

کسی کی چنری میں دھوپ باندھی کسی کو وجہء جمال رکھا
کسی کے دامن میں صبح ٹانکی کسی کو شب کی مثال رکھا

رضا پہ تری ہوئی میں راضی مگر مجھے آج یہ بتا دے
جواب سارے دیئے کسی کو مرے لئے کیوں سوال رکھا

فراق کی شب چمکتی یادوں کے جگنوں سے میں پوچھتی ہوں
مرے لئے کیوں نہ چاہتوں کا چراغ کوئی سنبھال رکھا

وہ آسماں مزاج جراحت سرشت تھا
ہم دل کے آئینے کو بچا کو نکل گئے

ہمسفر بعد تیرے اس دل کی
اُجڑی بستی تو ہم کھنڈر ٹھہرے

سکت سفر کو تو باقی نہیں ہے تیرے بعد
بس اب تو صرف سفر کو تمام کرنا ہے

داستاں اپنی سناتے تمہیں مہماں کرتے
ذکرِ جاناں غمِ دوراں غمِ ہجراں کرتے

کوئی آتا ہی نہیں ہے مرے غمخانے تک
دل کو بہلانے کو کیا شام غریباں کرتے

شہناز کی غزل کی ایک خوبی یہ ہے کہ خیال کی اور اندازِ بیان کی اُکتا دینے والی تکرار نہیں گرچہ غزل میں تقرار معنی اور الفاظ سے بچنا مشکل ہے عنوان ندرت خیال:

فصلِ گل نے کرلی ہے دوستی خزاؤں سے
پھول اب نہیں کھلتے خوشبوں کے موسم میں

کہیں پتھر نہ ہو جائیں یہ مری منتظر آنکھیں
پلٹ کر تم نے آنے میں بہت ہی دیر کر دی ہے

تمام عمر نہ جس کا جواب مجھ کو ملا
تمام عمر وہ ہی اک سوال میں نے کیا

خشک پتیاں رنگ کر شاخ پر سجا دینا
تتلیاں نہ مرجائیں پت جھڑوں کے موسم میں

نیم شب میں کہہ رہا تھا خونِ دل کی داستاں
رات کی آنکھوں میں کاجل شام کا پھیلا ہوا

۲۱ تغزل اور سوز گداز کے بہت سے روپ ان کی غزلوں میں نظر آتے ہیں

لفظوں کے پیرہن میں الجھ کر بھی کیا ملا
بے ساختہ سا وہ مرا لہجہ نہیں رہا

طوفاں سے کھیلنے کا قرینہ جو آ گیا
جلتا ہوا چراغ ہوا کو تھما دیا

اُٹھا دو پھر نیا طوفان کوئی
لبِ ساحل سفینہ آ گیا ہے

دیئے اُمید کے بجھنے لگے ہیں
ہوا سے دوستی مہنگی پڑی ہے

فیصلہ ڈوبنے والے نے کیا ہے آخر
جو کنارا نہ بنا اُس سے کنارہ کرلیں

موضوعات کے ساتھ فکری تابانی جگہ جگہ موجود ہے شہناز کی غزلوں میں تغزل بالعموم رچا ہوا ہے الفاظ کا دروبست اُنھیں منفرد مقام دیتا ہے۔

عثمان صدیقی

ذکرِ جاناں۔ غمِ دوراں۔ غمِ ہجراں

داستاں اپنی سناتے تمھیں مہماں کرتے
ذکرِ جاناں غمِ دوراں غمِ ہجراں کرتے

بہت عرصہ قبل یہ شعر کہا اور غزل مکمل کی کسے تھا کہ عشق تماشا کی پوری کہانی بالکل اسی انداز میں مرتب ہوگی یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا کب ہوا؟ کچھ معلوم نہیں؟ غمِ جاناں جو دراصل خود کو پہچاننے کے عمل کا نام ہے روزِ ازل سے ہی مقدر بنا دیا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ شدت اختیار کرتا گیا اب آگے یہ کیا رخ اور کونسی شکل اختیار کریگا اس کو سمجھنا میرے بس سے باہر ہے ان کیفیات کا علم آپ کو کتاب کے پہلے حصے کو پڑھ کر ہوگا۔

دوسرا حصہ غمِ دوراں پر مشتمل ہے ذہن نارسا کو جب غمِ جاناں سے فرار کی کوئی راہ نظر نہ آئی تو اس نے اپنا رخ غمِ دوراں کی طرف موڑ دیا غمِ دوراں رہی سہی کسر پوری کر رہا تھا اور میں اس غم کے ساتھ مستقل مزاجی آگے بڑھ رہی تھی کہ رستے میں غمِ ہجراں نے آن پکڑا۔

کتاب کا تیسرا حصہ غمِ ہجراں کی داستان ہے اب اس غم خانے تک کون آئے شام غریباں کیسے ہو شاید یہ غم زندگی کے آخری سانس تک ساتھ جائیں گے جس موسم گھٹ جانے کی دعا مانگی مگر ٹوٹ کر یوں ہوئی برسات کہ گھر ڈوب گیا۔ رستہ بھی کبھی ختم ہوا ہے رفتارِ زندگی قائم ہے اب سوچتی ہوں۔

درد ہے عشق کی معراج تو ڈرنا کیسا
آبلے پھوڑ کے رفتارِ سفر دیکھتے ہیں

دوبارہ ادبی منظرنامے پر طلوع ہونے تک آپ سے اجازت طلب کرتی ہوں آپ کی رائے کی منتظر رہوں گی آپ کی حوصلہ افزائی شعر و سخن کی وادی میں پا بجولاں آبلہ پائی کرنے والے مسافر کو آمادہ سفر رکھے گی۔

شہناز مزمّل
ادب سرائے
F-125 ماڈل ٹاؤن لاہور
8 نومبر 2001

غمِ جاناں

O

تمام عمر نہ جسکا جواب مجھ کو ملا
تمام عمر وہی اک سوال میں نے کیا

تری عنائتیں زیادہ ہیں یا مری چاہت
جو زخم تو نے دیئے اِندمال میں نے کیا

چھپایا تو نے جمال و جلال پردوں میں
جمال ڈھونڈنے والا کمال میں نے کیا

کبھی میں بن گیا مجنوں کبھی بنا رانجھا
بچھڑ کے تجھ سے عجب اپنا حال میں نے کیا

نہ چھپ سکا تو نظر سے نہ آشکار ہوا
لبادہ جذب کا اوڑھا دھمال میں نے کیا

الف بھی تیرا ہے اور لام میم بھی تیرا
اُٹھے نہ راز سے پردہ خیال میں نے کیا

نکالا اپنے جہاں سے ذرا سی لغزش پر
بچھڑ کے تجھ سے سوالِ وصال میں نے کیا

مری اکائی بھی تو ہے مرا سمندر بھی
مٹا کے خود کو تجھے بے مثال میں نے کیا

نعت ﷺ

لفظ کھلتے ہیں نہ کھلتے ہیں معنی آقا ﷺ
کیسے پائے مری تحریر روانی آقا ﷺ

کیفیت سے کبھی نکلوں تو کوئی بات بنے
اب تلک تو ہے نہاں عشق کہانی آقا ﷺ

جسم کی قید میں ہوں پھر بھی ہوں میں آپ کے ساتھ
کس لئے روح نے کی نقل مکانی آقا ﷺ

روبرو بیٹھ کے کچھ عرض میں کرنا چاہوں
ہجر لمحوں کی کہانی ہے سنانی آقا ﷺ

ہے خبر آپ کو شہناز مزمل شاہا ﷺ
عشق میں آپ کے کملی ہے دوانی آقا ﷺ

O

قائم ہوا ہے کب سے محبت کا سلسلہ
نے ابتدا ہے اسکی نہ کوئی ہے انتہا

مجھ کو زمیں پہ بھیج کے خود سے کیا جدا
تو ہی بتا دے کیسا رہا تیرا فیصلہ

آ کر زمیں پہ ڈھونڈتے پھرتے تھے ہم خدا
جھانکا تو اپنی ذات کے اندر چھپا ملا

پہچان جب ہوئی تو شناسا وہ بن گیا
قلب سیہ میں نور کا روشن ہوا دیا

عاشق تلاشِ عشق میں حد سے گذر گیا
اور عقل نے گمان کو منزل بنا لیا

نیرنگئی جمال نے مبہوت کردیا
تھا شہر سارا آئینہ خانہ بنا ہوا

منزل قریب آئی تو رستہ ہی کھو گیا
گمراہ کر رہے تھے مجھے سب نقوشِ پا

بس ایک نقشِ پا پہ ہوئی خم جبینِ شوق
پھر اسکے بعد نقشِ تمنا مٹادیا

مجھ کو ہر ایک فکر سے آزاد کردیا
پختہ ہوا یقین تو جذبے ہوئے دعا

آؤ نا اب پکار کے دیکھیں اسے ذرا
دیتا ہے کیا جواب ہمیں وہ بھی برملا

عاشق یقیں کا ہاتھ میں تھامے گا جب دیا
مل جائے گا جواب اسے ہر سوال کا

طوفاں سے کھیلے

O

ہر اک منظر میں خود کو ڈھونڈتا ہے
ترا عاشق تماشا بن گیا ہے

نیا ہر زوایہ اُمید کا ہے
بھروسے سے بھروسہ اُٹھ گیا

فصیلِ جسم شاید گر رہی ہے
یہ دل پہلو میں اب رُکنے لگا ہے

ہر اک بستی ہے اب صحرا کی صورت
مجھے ہی کیوں اکیلا کردیا ہے

شب ہجراں شب قربت بنادے
چراغ نیم شب بجھنے لگا ہے

نماز عشق قائم ہوگئی ہے
ترا عاشق مکمل ہوگیا ہے

میں جو مانگوں گی وہ مجھ کو ملے گا
بتا کاتب ترا کیا فیصلہ ہے

O

ایک اندھا راستہ عاشق کو دکھلایا گیا
عشق ھست و بود ہے ناداں کو سمجھایا گیا

مان تُو نے توڑ ڈالا میں یہ کیسے مان لوں
تُو نہیں مجھ سے الگ یہ کیوں تھا بتلایا گیا

تُو بتا دے تیرگی تیرے مسافر کیا کریں
روشنی میں روشنی کا راستہ پایا گیا

ڈوب ہی جانا مقدر تھا سفینے کا تو پھر
کس لیئے ساحل دکھا کر اُس کو تڑپایا گیا

عشق پابندِ سلاسل ہے نہ پابندِ مکاں
بے وجہ دیوار میں عاشق کو چنوایا گیا

چھاؤں کی لذت بھلا سورج کو کب معلوم ہے
جلتے سورج کے تلے ہی دور تک سایہ گیا

عشق سے ناراض ہوں معشوق سے بھی ہوں خفا
مجھ سا عاشق وعدۂ فردا پہ ٹرخایا گیا

O

اس تصوف کا فلسفہ کیا ہے
مستقل فکر جان میں رکھنا

ہے تصور سے ماورا کوئی
صرف اس کو دھیان میں رکھنا

کیا ہے انداز یہ توجہ کا
ہرگھڑی امتحان میں رکھنا

جوت خود دید کی جلا دینا
پردہ اک درمیان میں رکھنا

تیرے اندر وہ بولتا ہے اب
مت نظر آسمان پر رکھنا

O

کون کہتا ہے کہ مجھ سے دور کوہِ طور ہے
نور ہے تیرا نظر میں دل میں تو مستور ہے

ڈھونڈنا تجھ کو نہیں مشکل مرے دل کے مکیں
تو رگوں میں دوڑتا ہے چشمِ ترکا نور ہے

مان لوں میں کسطرح کہ کچھ بدل سکتا نہیں
تیرے ہی تو ہاتھ کا لکھا ہوا منشور ہے

میں ہوں تیری تُو ہے میرا ساری دنیا کو بتا
بعد اس کے جو بھی ہوگا فیصلہ منظور ہے

دل میں تُو سوچوں میں تُو چاروں طرف بس تُو ہی تُو
ساتھ تیرے جو نہ گذرے وہ شب دیجور ہے

O

تیر اپنا کمان میں رکھنا
سب کو حفظ و امان میں رکھنا

کم نگاہوں کو کم نما رکھنا
کم یقیں کو گمان میں رکھنا

ہر دعا میری معتبر کرنا
اک اثر اس زبان میں رکھنا

بچ نہ پائے کوئی نظر سے تری
زاویہ وہ مچان میں رکھنا

لامکانی ہے بس تجھے زیبا
باقی سب کو مکان میں رکھنا

O

مرے اندر تو اسکی روشنی ہے
تعلق جس سے میرا دائمی ہے

میں اپنے آپ کو کیسے سمیٹوں
اکائی ذات کی بکھری پڑی ہے

فصیل شب کا آنچل بھیگتا ہے
سحر کی آنکھ بھی کچھ شبنمی ہے

دیئے امید کے بجھنے لگے ہیں
ہوا سے دوستی مہنگی پڑی ہے

مری پلکوں پہ تارے ٹوٹتے ہیں
کسی سے پھر بچھڑنے کی گھڑی ہے

دریچہ دل کا پھر سے کھولتی ہوں
سماعت پر مرے دستک ہوئی ہے

کوئی آہٹ ہو لمحے جاگ اُٹھیں
خموشی جان لیوا ہوگئی ہے

O

دل تو اُس کے جمال میں گم ہے
سائیں سوہنا کمال میں گم ہے

عقل کو لمحہء فراق ملا
عشق کیفِ وصال میں گم ہے

پار کر کے یقیں کی دہلیز
کیوں ابھی تک سوال میں گم ہے

حادثہ تو گذر گیا سر سے
اک کسک اندمال میں گم ہے

O

مصور تو مری تصویر بن جا
مرے کاتب مری تقدیر بن جا

ادھورے خواب پورے کر کے پھر تو
مرے ہر خواب کی تعبیر بن جا

بہت طُرفہ تماشا ہوگیا ہے
بدل بیڑی نئی زنجیر بن جا

تُو اپنی ذات سے باہر نکل کر
کتابِ وقت کی تحریر بن جا

تری خواہش نشانہ پھر خطا ہو
کسی ڈھیلی کماں کا تیر بن جا

O

بدل گئی ہے سوال وجواب کی صورت
نقاب میں وہ ملا بے نقاب کی صورت

سراپا پیار ہے وہ نور ہے وہ ممتا ہے
لگا کے آگ بجھائے سحاب کی صورت

وجود سے مجھے آزاد کرکے اکثر وہ
سمندروں پہ اُتارے حباب کی صورت

عجب ہے عشق کہ پہچان بھی نہیں اپنی
کچھ اور ہوگی ترے انتخاب کی صورت
سمجھ میں آتی نہیں

نوشتہ روزِ ازل سے ہے لوح پر محفوظ
دکھائی دیتی ہے دنیا سراب کی صورت

O

میں تھی بجھے دیئے کی طرح طاق میں سجی
پہچان ہوگئی تو مجھے روشنی ملی

اپنی تلاش کرتے زمانہ گذر گیا
میں کون ہوں میں کس لیئے دنیا میں آگئی

عرفانِ ذات نے مجھے حیران کردیا
دوڑا رہا ہے مجھ کو مرا ذوقِ آگہی

روزِ ازل سے عشق کی مجھ کو تلاش تھی
جب سر جھکا دیا تو مجھے بندگی ملی

اب تک الجھ رہا تھا مرا ذہن نارسا
نظرِ کرم سے آپ کے بالیدگی ملی

تو نے تو اپنے نور سے مجھ کو جدا کیا
لیکن جو روح جسم میں تجھ میں سما گئی

O

سارا سفر ہی مرا بے کار رائیگاں تھا
میرے لئے بنا یا کیا اور آسماں تھا

چاہا تو تھا پلٹنا لیکن پلٹ نہ پائی
حائل وجود میرا میرے ہی درمیاں تھا

لا حاصلی کے در پر حیران سی کھڑی تھی
کچھ بھی سمجھ نہ پائی جانا مجھے کہاں تھا

شاید نشانِ منزل اُس کو نہیں ملا تھا
وہ چل رہا تھا پیچھے جو میرِ کارواں تھا

یہ کیسا المیہ ہے اس شخص کو ہمیشہ
حرفِ غلط ہی سمجھا جوزیب داستاں تھا

پابندیوں سے خود کو آزاد تُو نے رکھا
تھا لامکان تیرا میرے لئے مکاں تھا

O

حصارِ ذات سے باہر ذرا نکل تو سہی
تو اپنا راستہ اک بار پھر بدل تو سہی

شناخت ہو کہ نہ ہو اب یہ سوچنا کیا
گلے میں نام کی تختی پہن کے چل تو سہی

تجھے خبر نہیں تو راکھ ہے یا ہیرا ہے
خود اپنی آگ میں کچھ دیر اور جل تو سہی

بہت ہی دیکھ لیں شب کی طوالتیں اب تو
نئی اُمید کے سورج ذرا نکل تو سہی

زمانہ تجھ سے ہے یا تو ہے اس زمانے سے
پہن کے طوقِ سلاسل ذرا سنبھل تو سہی

ٹوٹے دل کی دعا محبت ہے
ایک جلتا دیا محبت ہے

O

عشق منزل سفر محبت ہے
اک عجب سلسلہ محبت ہے

ٹوٹے دل کی دعا محبت ہے
ایک جلتا دیا محبت ہے
اک عجب سلسلہ محبت ہے

آسماں سے زمیں پر اُترا ہے
اک وسیع دائرہ محبت ہے

چشمِ پُرنم ہو دل پریشاں ہو
یہ ترا فیصلہ محبت ہے

کتنی پیاری

کوئی لمحہ نہ وصل کا آئے
ایک ~~لمبی~~ سزا محبت ہے

ہو محبت فنا تو عشق بنے
عشق اللہ خدا محبت ہے

ہم نے عشق علی سے سیکھا ہے
عاشقی کیا ہے کیا محبت ہے

آج تک جو سمجھ میں نہ آیا
اک عجب سلسلہ محبت ہے

جان دے کر یہ بات سمجھا دی
اصل میں کربلا محبت ہے

وصل کی ہر گھڑی تمنا ہو
کتنی پیاری سزا محبت ہے

O

عجب محشر سا اک مجھ میں بپا ہے
مرے اندر بھی شاید کربلا ہے

بہت آرام تھا خاموشیوں میں
تماشا عشق نے بنوا دیا ہے

کیا پھر جاگی کوئی خوابیدہ حسرت
ترے ہونٹوں پہ پھر حرف دعا ہے

کسی معصوم خواہش نے جکڑ کر
زمانے بھر میں رسوا کردیا ہے

بتاؤ چھین کر اپنا حوالہ
مجھے کس کے حوالے کردیا ہے

تجھے ہر حال میں سننا پڑے گا
غلط ہے یا صحیح ہے فیصلہ ہے

بظاہر ہوں میں اک ناچیز قطرہ
مرے اندر سمندر بولتا ہے

ہراساں تنہا تنہا پھر رہی ہوں
بھرے میلے میں ساتھی کھو گیا ہے

کسی بھی روپ میں پھر سامنے آ
تجھے دیکھے زمانہ ہوگیا ہے

تجھے چپ چاپ سب سہنا پڑے گا
رضا اُس کی ہی اب تیری رضا ہے

گماں سے بدگمانی ہوگئی ہے
یقیں کے ہاتھ اب تو فیصلہ ہے

نہیں معلوم یہ میں ہوں کہ تو ہے
مصور خود کسی تصویر سا ہے

نہیں شہناز کچھ رونے سے حاصل
جوہونا تھا وہ آخر ہوگیا ہے

O

اپنے آپ میں کھونے دے اب
عشق تماشا ہونے دے اب

جاگتے جاگتے عمر گنوائی
عشق کی چھاؤں سونے دے اب

ہنسنے والے مردہ دل ہیں
زندہ دل کو رونے دے اب

کاٹ کے ساری فصل پرانی
بیج نیا اک بونے دے اب

عشق تماشا ہونے دے اب
اپنے آپ میں کھونے دے اب

نظمیں

دل دریا عشق سمندر

عشق سمندر کیسے پہنچوں
دریا رستے میں اتنے ہیں
آگ کے دریا خون کے دریا
دل بھی دریا آنسو دریا
دریا اندر بھی اک دریا
میں بھی دریا تو بھی دریا
عشق سمندر کیسے پہنچیں
دریا بن کر بہتے بہتے
طوفاں کے دکھ سہتے سہتے
آگے آگے بڑھتے جائیں
بہتے بہتے ڈھونڈ ہی لیں گے
عشق کا گہرا میٹھا ساگر
جس میں ہم کو کھو جانا ہے
عشق سمندر ہو جانا ہے

عکس کی خاطر

آئینے دھندلا ہی جاتے ہیں
کیوں میں پورے عکس کی خاطر
صیقل کرتے آئینہ گر کے
سامنے
اپنا کاسہ رکھوں
بھیک میں ملنے والا تخیل
مٹ جاتا ہے
انساں اپنے عکس کی خاطر
اپنے ہاتھوں لٹ جاتا ہے

قطعات

آسماں سائباں جیسا ہے
لامکاں کب مکان جیسا ہے
پار کر کے یقین کی دہلیز
اب یقیں بھی گمان جیسا ہے

تعبیر ڈھونڈ لی ہے خوابوں کو کھو دیا ہے
منزل کی جستجو میں رستوں کو کھو دیا ہے
تجسیم کر لیا ہے میں نے حسیں تخیل
تحریر بن گئی ہے جذبوں کو کھو دیا ہے

آرزو کی جھیل کو دریا کبھی کرنا نہیں
شہر ناپُرساں میں جانے سے کبھی ڈرنا نہیں

غمِ دوراں

O

نفرتوں کا زہر چاروں سمت ہے پھیلا ہوا
زندگی کو وحشتوں کا ناگ پھر ڈسنے لگا

ہاتھ میں پتھر اٹھائے پھر رہا آجکل
شیشہء دل کے مسیحا کو اچانک کیا ہوا

ڈار سے بچھڑے پرندے لوٹ کر آئے نہیں
تیر برسائے فضا نے راہزن رستہ ہوا

نیم شب میں کہہ رہا تھا خون دل کی داستاں
رات کی، آنکھوں میں کاجل شام کا پھیلا ہوا

میں نے برجستہ کہا جو کچھ بھی میرے دل میں تھا
میری نادانی کا سارے شہر میں چرچا ہوا

وقت کی اس دوڑ میں شکوہ گلہ کس سے کروں
سوچتی ہوں جو ہوا جیسا ہوا اچھا ہوا

کب رہی غافل تصور سے ترے میں ایک پل
تیرا چہرہ ہر گھڑی ہر گام پر دیکھا کیا

O

گلوں پر ٹوٹ پڑی ہیں قیامتیں کیسی
لگی ہیں ~~پھوٹنے کانٹوں سے کونپلیں کیسی~~
پھیلنے گلشن میں لغزشیں کیسی

بدن میں گڑتے رہے دن میں دھوپ کے نیزے
سکوتِ شام میں اتری ہیں وحشتیں کیسی

حصارِ چادر و دستار بھی جہاں ٹوٹے
گواہی کون وہاں دے وضاحتیں کیسی

بجھا دیا ہے سرِ شام میں نے خود ہی چراغ
ہوائے شہرِ نگاراں پہ تہمتیں کیسی

بہت زمانے سے صحرائے ذات میں گم ہوں
بدلتی رت سے بھلا اپنی نسبتیں کیسی

قفس کی تیلیاں چبھنے لگی ہیں آنکھوں میں
بغیر تیرے گذاری ہیں ساعتیں کیسی

ہمارے نام کی تختی بھی اب نہیں باقی
ہمارے حصے میں آئی ہیں شہرتیں کیسی

O

گر ٹوٹ بھی جاؤں تو بکھرنے نہیں دیتا
پیکر وہ مرا مجھ کو بدلنے نہیں دیتا

ہر وقت کئے رکھتا ہے دل مجھ کو ہراساں
کچھ کام مجھے ڈھنگ سے کرنے نہیں دیتا

زنجیر مرے پاؤں میں ڈالی ہے گماں نے
اور مجھ کو یقیں حد میں ٹھہرنے نہیں دیتا

قسمت ہے چراغوں کی جلیں آخرِ شب تک
الزام ہواؤں کا ٹھہرنے نہیں دیتا

تارے کی طرح شب کے اندھیرے میں چمک کر
جگنو کبھی چڑیا کو بھٹکنے نہیں دیتا

دشمن ہے پرندوں کا بدلتا ہوا موسم
گھر اُن کا کسی پیڑ پہ رہنے نہیں دیتا

سورج کو محبت ہے یاد شمن ہے مرا وہ
کیوں چاند مرے گھر میں اُترنے نہیں دیتا

اک سرد سیہ رات بچھڑنے کا وہ منظر
جینے نہیں دیتا مجھے مرنے نہیں دیتا

محشر سا بپا رکھتا ہے وہ حشر بداماں
مجنوں کو جنوں ہوش میں رہنے نہیں دیتا

گرداب بھنور اور یہ موجوں کا سلیقہ
دریا کو کناروں سے نکلنے نہیں دیتا

خوشبو کی طرح ساتھ ہے شہناز کے ہر دم
تنہائی کے جنگل میں بھٹکنے نہیں دیتا

O

باثر ہو کہ بے اثر ٹھہرے
بات وہ ہے جو معتبر ٹھہرے

آپ نے کیا دیا زمانے کو
ہم تو بے فیض بے ہنر ٹھہرے

ہمسفر بعد تیرے اس دل کی
اُجڑی بستی تو ہم کھنڈر ٹھہرے

میں نے بس ایک ہی دعا کی تھی
ساتھ میرے وہ عمر بھر ٹھہرے

اپنی قسمت میں دشت پیمائی
رُک گئے ہم جہاں وہ گھر ٹھہرے

آنکھ جھپکی تو آگئی منزل
راستے کتنے مختصر ٹھہرے

عمر گذری ہے اک تلاطم میں
اپنی تقدیر میں بھنور ٹھہرے

کوئی آہٹ نہ چاپ قدموں کی
ایسی سنسان رہگذر ٹھہرے

اپنی پہچان بھی نہیں ہوگی
اب یہاں اور ہم اگر ٹھہرے

کام آئی نہ کچھ مسیحائی
آبلہ پا ہی در بدر ٹھہرے

ہے عجب رسم اس زمانے کی
سر نہیں جن کے تاجور ٹھہرے

ہاتھ خالق کا میں نے تھام لیا
اب نہ تقدیر کار گر ٹھہرے

O

ادھورا نقش مٹانا بہت ضروری تھا
فریب کھا کے بھلانا بہت ضروری تھا

شبِ فراق مسافر کی میزبانی کو
بجھا چراغ جلانا بہت ضروری تھا

خموشیوں کی زباں ہی زباں نہ بن جائے
اُٹھی نظر کو جھکانا بہت ضروری تھا

رُخِ حیات میں کچھ شوخ رنگ بھرنے کو
کسی کے خواب چرانا بہت ضروری تھا

مری طرح سے جو حیرانیوں کا مسکن ہے
اُس آئینے کو بچانا بہت ضروری تھا

بکھرتے ٹوٹتے مہرے سنبھالنے کے لئے
بساطِ جان بچھانا بہت ضروری تھا

بہت سے کام ادھورے ہی چھوڑ کر شہناز
پلٹ کے گھر بھی تو جانا بہت ضروری تھا

O

نکلنا چاہتے ہیں اب گماں سے
خدا کو ڈھونڈ کر لائیں کہاں سے

شبِ زنداں فروزاں ہوگئی ہے
دھواں اٹھنے لگا ہے آشیاں سے

پڑاوٗ کا ارادہ ترک کر کے
نکل آئے ہیں ہم خالی مکاں سے

سمندر خود بلانے آ گیا ہے
گریزاں جب ہوئے ہیں بادباں سے

پرندے بستیوں سے خوف کھا کر
اٹھا لائے ہیں تنکے آشیاں سے

پلک جھپکی تو منزل آگئی ہے
ہمیں شکوہ ہے میرِ کارواں سے

غبارِ دشت بن کر اُڑ رہے ہیں
نکل کر ہم ہجومِ بیکراں سے

تعلق جوڑ لو پھر سے پرانا
نکالو آ کے یادِ رفتگاں سے

O

خزاں کے رُخ پہ اک عجب خمار دیکھتی رہی
غبارِ دشت میں گھری بہار دیکھتی رہی

طلسمِ شہرِ نارسا پکارتا رہا مجھے
طلسمِ ذات سے بندھا حصار دیکھتی رہی

معصومیت تھی وہ مری یا خود پہ اعتبار تھا
جو نفرتوں میں ڈھل گیا وہ پیار دیکھتی رہی

ایسی تھکن سے چُور تھی اُٹھ کر نہ جا سکی کہیں
میں قافلے کی منتظر غبار دیکھتی رہی

جو کچھ اُسے نصیب تھا وہ میرا کب نصیب تھا
وہ جیتتا چلا گیا میں ہار دیکھتی رہی

O

راتوں کا مقدر کبھی بدلا نہیں کرتا
دن شام سے پہلے کبھی ڈوبا نہیں کرتا

تتلی تو چرا لیتی ہے پھولوں سے سبھی رنگ
جگنو تو چراغوں پہ بھروسہ نہیں کرتا

سناٹے نے گھیرا ہے مجھے چاروں طرف سے
کوئی بھی تیرے بعد پکارا نہیں کرتا

طوفان بلا خیز کے تیور کو سمجھ کر
کشتی کوئی منجدھار میں ڈالا نہیں کرتا

حیراں ہوں بہت ضبط پر اس شخص کے شہناز
گردن پہ ہو خنجر بھی تو بولا نہیں کرتا

O

دوستوں کی دوستی کا یوں بھرم رکھتے رہے
بے خبر رہ کر بھی اپنی مخبری کرتے رہے

جب ملی چھاؤں ہمیشہ دھوپ کے نیچے ملی
عمر بھر ہم انتظارِ سائباں کرتے رہے

بیچ رستے میں نہ کوئی ساتھ اپنا چھوڑ دے
ہر گھڑی اندیشۂ فردا سے ہم ڈرتے رہے

کھو گیا منزل کا رستہ ہمسفر بھی کھو گیا
جانے کس امید پہ چلتے رہے چلتے رہے

رنجشوں کے سازشوں کے تلخیوں کے دور میں
زندگی سے دور رہ کر زندگی کرتے رہے

آس ٹوٹی دل بھی ٹوٹا اک انا قائم رہی
سر نہ جھکنے پائے ہردم یہ دعا کرتے رہے

O

ہوا بادل سے رُک کر پوچھتی ہے
خزاں کی عمر کیوں بڑھنے لگی ہے

تراشا جب سے نخلِ آرزو کو
یہ کشتِ جاں بنجر ہوگئی ہے

فصیلِ درد کے گنبد میں شب بھر
تری آواز اب تک گونجتی ہے

لبادہ شب کا اوڑھے چاندنی پھر
مری دہلیز پر رکنے لگی ہے

کوئی آہٹ ہو لمحے جاگ جائیں
خموشی جان لیوا ہوگئی ہے

کٹے گا اب یہ کیسے حبس موسم
ہوا ساکت ہے بارش تھم گئی ہے

دکھا شہناز کو اب خواب رستہ
یہ لمبی رات اب ڈسنے لگی ہے

O

تیر ٹوٹا کمان کی زد میں
ہیں شکاری مچان کی زد میں

کیسے ڈھونڈوں گی منزلِ امید
رُخ بدلتی چٹان کی زد میں

ظلمتِ شب کا خوف بے معنی
میں ہوں تیرے دھیان کی زد میں

تو ہے لاریب لا مکاں کا مکیں
خلق ساری مکان کی زد میں

دوستوں سے پناہ مانگی ہے
دشمنوں کی امان کی زد میں

فکر موسم میں کیوں تغیر ہے
کیا یقیں ہے گماں کی زد میں

چُپ ہے شہناز ایک مدت سے
نوکِ خنجر میان کی زد میں

O

راہ میں اپنی چراغِ رہگذر بیکار تھا
رک ہی جانا تھا تو پھر سارا سفر بے کار تھا

جب مری تقدیر میں چھاؤں نہیں لکھی گئی
میرے آنگن میں اگا ہر اک شجر بیکار تھا

پھر ہوا ایسا کہ سائے شہر کے جلنے لگے
چشمِ نم بے کار تھی دامانِ تر بے کار تھا

بھید کھل پایا نہیں گر تجھ پہ ہست وبود کا
گردشِ دوراں ترا سارا سفر بے کار تھا

مجھ کو ساحل کے حوالے کردیا موجوں نے پھر
میرے پاؤں سے بندھا ہر اک بھنور بے کار تھا

جب تیری اولاد ہی تجھ سے نہیں ہے مطمئن
تیری ساری جستجو سارا ہنر بے کار تھا

دھوپ کی بستی میں پتھر کا بناتی سائباں
موم سے پگھلا ہوا شہناز گھر بے کار تھا

O

زرد موسم کو اجالوں میں چھپا رہنے دو
مری دیوار پر سورج کی ردا رہنے دو

سر اُٹھانے کی کہیں یہ نہ جسارت کرلیں
خس و خاشاک کو مٹی میں دبا رہنے دو

راستہ ڈھونڈ لے شاید کوئی بھولا بھٹکا
ان چراغوں کو سرِ راہ جلا رہنے دو

شوقِ آوارگی کچھ اور ابھی باقی ہے
منزلوں سے مجھے کچھ دیر جدا رہنے دو

پھر نہ دستک کھلی چوکھٹ پہ ہوائیں دیں گی
درشکستہ سہی کچھ دیر کھلا رہنے دو

مجھ کو اجداد کی اقدار بہت پیاری ہیں
میری دہلیز پہ مٹی کا دیا رہنے دو

ہمسفر مجھ کو دکھاؤ نہ نشانِ منزل
مجھ کو ملتا ہی نہیں اپنا پتا رہنے دو

تشنگی دید کی کم ہو نہیں پائی اب تک
خشک ہونٹوں پہ کوئی حرفِ دعا رہنے دو

موت تو درد کا درماں نہیں ہوتی شہناز
محشرِ زیست ہی کچھ دیر بپا رہنے دو

O

جب زاویئے نگاہ کے یکسر بدل گئے
پھیلی تپش تو نقشِ تمنا پگھل گئے

وہ آسماں مزاج جراحت سرشت تھا
ہم دل کے آئینے کو بچا کر نکل گئے

اس عہد کے یزید کا کس سے کریں گلہ
خیمے تمام اپنے ہی ہاتھوں سے جل گئے

وہ انتہائے زعم میں پیچھے مڑا نہیں
ہم انتہائے شوق میں آگے نکل گئے

ظلمت شبِ سیہ کی سہتے رہے مگر
آئی نظر کرن تو ارادے بدل گئے

O

آئینے چٹختے ہیں حیرتوں کے موسم میں
خود سے بھی نہیں ملتے شہرتوں کے موسم میں

فصلِ گل نے کرلی ہے دوستی خزاؤں سے
پھول اب نہیں کھلتے خوشبوؤں کے موسم میں

خشک پتیاں رنگ کر شاخ پر سجا دینا
تتلیاں نہ مرجائیں پت جھڑوں کے موسم میں

پیڑ تو نبھاتے ہیں ساتھ رہنے والوں کا
گھونسلے سلامت ہوں آندھیوں کے موسم میں

خواب بھی ادھورے ہیں ساتھ بھی ادھورے ہیں
ہیں یہاں ادھورے سب خواہشوں کے موسم میں

حبس پیش خیمہ ہے آنے والے طوفاں کا
بند ٹوٹ جاتے ہیں بارشوں کے موسم میں

آبلے تو پھوٹیں گے کرچیوں کے چبھنے سے
پا فگار چلنا ہے ہجرتوں کے موسم میں

دیپ اک جلا دینا شام کو سرِ راہے
رہزنی سے کیا ڈرنا قافلوں کے موسم میں

چوڑیاں کھنکتی ہے چنریاں سنبھلتی ہیں
رنگ تو بکھرتے ہیں رتجگوں کے موسم میں

دشمنی کے موسم میں احتیاط لازم ہے
دوستوں سے بچنا ہے سازشوں کے موسم میں

آس ٹوٹ جائے تو سانس رکنے لگتی ہے
زندگی سے ڈرتے ہیں تہمتوں کے موسم میں

راکھ میں دبا شعلہ آگ بن کے بھڑکے گا
آندھیاں تو چلتی ہیں فاصلوں کے موسم میں

وہ ہیں گر ستمگر تو ہم ستم شناسا ہیں
نفرتوں کا پہرہ ہے چاہتوں کے موسم میں

وقت کے بدلنے سے قسمتیں بدلتی ہیں
آؤ ہم دعا مانگیں آیتوں کے موسم میں

پاس میرے ہوکر بھی پاس وہ نہیں میرے
دوریاں یہ کیسی ہیں قربتوں کے موسم میں

O

ٹوٹنے والے تعلق کا اعادہ کر لیں
آؤ کچھ دیر محبت پہ بھروسہ کر لیں

فاصلے بڑھتے گئے بات بنائے نہ بنی
کچے بندھن نہیں باندھیں گے ارادہ کرلیں

برف کی سل کو نہ چھونا کبھی جل جاؤ گے
شمعِ قربت کو بجھا دینے کا وعدہ کر لیں

فیصلہ ڈوبنے والوں نے کیا ہے آخر
جو کنارہ نہ بنے اُن سے کنارا کر لیں

دیکھ نہ لے کوئی پلکوں پہ چمکتے جگنو
آبگینوں کو چھپا نین ستارا کرلیں

نظمیں

شکستہ کل کا نوحہ

ہوا زہراب شہر نارسا سے
بکھرتے ٹوٹتے پر چن رہی ہے
شکاری گھات میں ہیں ساعتِ شب
اندھیرے کی مچانیں بُن رہی ہیں
زوالِ عہد میں لرزاں سماعت
شکستہ کل کا نوحہ سن رہی ہے

نہیں ملے گا

وہ جل کے دیکھے
پگھل کے دیکھے
وہ گر کے دیکھے
سنبھل کے دیکھے
نہیں ملے گا نہیں ملے گا

جو چاہتا ہے
وہ جسم جاں کی حقیقتوں کو
اگر نہ مانے
وہ وقت کی تیز دھار سہہ کر
خمار میں ہی غبار بن کر
نکل پڑا ہے
صلیب اپنی خود اپنے کاندھوں پہ
لاد کر وہ
جنازہ اپنی ہی آرزو کا نکل کے دیکھے

احساسِ کم مائیگی

میں ہوں اک ذرۂ ناچیز
مجھے علم ہے یہ
جانے کس سمت لئے جاتا ہے
بے مایہ وجود
مجھ کو پاتال میں لے آیا ہے
طوفانِ جہاں
روشنی ہونے کی ملتی ہی نہیں
کوئی خبر
اپنے ہونے کی زمانے کو خبر کیسے دوں

چلتی پھرتی لاش

روزِ ازل سے محکومی کی
چکی میں
پستی ہے عورت
ظلم کی روشن آگ میں زندہ
جل کر مر جاتی ہے عورت
محرومی کا پھندا پہنے
گھٹ گھٹ کر جیتی ہے عورت
کھلی قبر میں
چلتی پھرتی لاش کی صورت
دیکھی عورت
عورت بھینٹ چڑھانے والو
اپنا حق منوانے والو
آج ذرا یہ تو بتلاؤ

عورت کے جائز حق کو بھی
تم نے کب تسلیم کیا ہے
عورت چاہے نیک ہو
بد ہو
سر سے پانی اونچا ہو تو
اپنا حق منوانے کی خاطر
جبر کے سارے بندھن توڑ کے
گھر سے باہر آ جاتی ہے
پاکیزہ معصوم سی عورت
عزت داؤ لگا جاتی ہے
اپنا آپ گنوا جاتی ہے
حق تو اسکو کب ملتا ہے
حق کی متلاشی عورت کو
عریاں ذہن کے مالک چہرے
آزادی کی چھاپ لگا کر
مصنوعی اک خول چڑھا کر
جھوٹی رسمی آس دلا کر
عورت کو عورت منوا کر

ہمدردی کا جال بچھا کر
شمع محفل اُس کو بنا کر
دام میں یوں اُلجھا لیتے ہیں
اپنی ڈیٹ منا لیتے ہیں
عورت کو عورت ہونے کی
اتنی سخت سزا دیتے ہیں
شیطانوں کی اس بستی میں
بند دروازے توڑ کے اکثر
چور لٹیرے آ جاتے ہیں
اپنا حصہ اس کو سمجھ کر
اُس کا حصہ کھا جاتے ہیں
دامن داغ لگا جاتے ہیں
کیوں نہ ان سے
آج ذرا میں بھی تو پوچھوں
عورت نے کیا جرم کیا ہے
عورت کا بس جرم یہی ہے
اُس نے تو بس پیار کیا ہے
ممتا کا کردار کیا ہے

تم نے عورت جان کہ اس کو
خوار کیا سنگسار کیا ہے
عورت کیا ہے میں بتلاؤں
بیٹی عورت بیوی عورت
بانجھ بھی عورت ماں بھی عورت
باندی عورت رنڈی عورت
نیک بھی عورت بد بھی عورت
رُوپ بھی عورت پیار بھی عورت
قدرت کا شاہکار بھی عورت
میں تو بس اتنا ہی جانوں
عورت نام ہے ممتا کا
اور عورت تو بس ماں ہوتی ہے

خود ساختہ اندھا نگر

یہ سب انسان ہیں لیکن
بہت مدت سے یہ سیلن زدہ قبروں میں رہتے ہیں
یہاں ہر روز جیون بانٹنے کو اک نیا سورج نکلتا ہے
مگر اس کی حرارت روشنی کب سب کو ملتی ہے
یہاں سورج بھی پابندِ سلاسل ہے
اسے اپنی حرارت بانٹنے کے واسطے
دیوار کے اس پار بیٹھے ناخداوں سے
اجازت لینا پڑتی ہے
خدا تو ایک ہے سب کا
مگر یہ ناخدا سب کے نہیں ہیں
نہ جانے کیسے دنیا کے خداؤں نے یہ سوچا ہے
حرارت زندگی اور روشنی بس ان کا حصہ ہے
بڑی دیوار کے اُس پار جتنے لوگ رہتے ہیں
مقدر میں توانائی نہیں لکھی گئی اُن کے

وہ اس سورج کی دنیا میں تو رہتے ہیں
مگر سیلن زدہ قبریں غلاظت سے اٹے رستے
ہی تو تقدیر ہیں ان کی
گلہ سورج سے ہے ان کو
اور نہ بڑی دیوار کے اس پار بیٹھے ناخداؤں سے کوئی شکوہ
مگر دونوں طرف پلتے ہوئے معصوم بچے
جب کبھی آپس میں ملتے ہیں
تو اکثر بات کرتے ہیں
کہ ظلم و جبر کہ خودساختہ اندھے نگر کا سرپھری تقسیم کا
نگران کیسا ہے
کیا اس نے جھانک کر دیوار کے اس پار اور اُس پار دیکھا ہے
کبھی وہ چند لمحوں کے لئے سیلن زدہ قبروں میں اترا ہے
مگر وہ ناخدا شاید بڑی دیوار کے اُس پار
عالیشان بنگلوں نرم بستر اور سرسراتے ریشمی کپڑوں سے اُٹھتی ہوئی
مدہوش کُن خوشبو میں جکڑا ہے
تروتازہ گُل ولالہ چمکتے چاند سے چہرے
بڑی دیوار کے اُس پار جا کر جھانکنے دیتے نہیں اس کو
کبھی اے کاش ایسا ہو

کبھی اے کاش ایسا ہو
کہ وہ سیلن زدہ بدنما سی تنگ قبروں میں اُتر کر بھی ذرا دیکھیں
جہاں خود ساختہ اندھے نگر میں
اُس جیسے ہی کئی انسان بستے ہیں
انھیں بھی سانس لینے کو ہوا درکار ہوتی ہے
غذا ملتی نہیں تو زندگی دشوار ہوتی ہے
وہ کیڑوں سے بھی کم تر ہیں
وہ مردوں سے بدتر ہیں
وہ زندہ لاش کی صورت
نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
خدائے لم یزل کی اس زمیں پر
زندگی بھر وہ حرارت کو ترستے ہیں
یہ سب انسان ہیں لیکن
بہت مدت سے وہ سیلن زدہ قبروں میں رہتے ہیں

کل آج کل

بہت مدت ہوئی تم نے کہا تھا چھوڑ دو لکھنا
تم عورت ہو غزل ہو روپ ہو اتنا ہی کافی ہے
اگر تم شعر لکھو گی تو گم ہو جائیگی عورت
بہت ناداں تھے محکوم تم نے مجھ کو مانا تھا
بہت ناداں تھے مظلوم تم نے مجھ کو مانا تھا
غلط سمجھا تھا میری سوچ پر پہرے بیٹھا دو گے
غلط سمجھا تھا میری فکر کو بنجر بنا دو گے
غلط سمجھا کٹ پتلی بنا کر تم نچا دو گے
غلط سمجھا تھا مجھ کو میرے ہونے کی سزا دو گے
میرا ناطہ قلم کاغذ سے انمٹ ہے پرانا ہے
مجھے اک کاغذی ناؤ پر ہی دریا پار جانا ہے
مجھے جرات حرارت زندگی لفظوں سے ملتی ہے
میں چنری اوڑھ کر الفاظ کی دھوپوں میں چلتی ہوں
میں ہر لمحہ نئے احساس کی بھٹی جلتی ہوں

میں سورج ہوں مگر جذبوں کی حدت سے پگھلتی ہوں
میری تحریر میری ذات کا پرتو ہے ایماں ہے
میری تحریر میرا بادباں ہے سائباں بھی ہے
مجھے اشعار ماں کی گود کی مانند لگتے ہیں
میں اکثر نظم کے کنجِ اماں میں بیٹھ جاتی ہوں
میں عورت ہوں غزل ہوں روپ ہوں یہ ٹھیک ہے لیکن
تقدس بھی ہوں حرمت بھی ہوں سرتا پا محبت ہوں
نجابت ہوں دیانت ہوں رفاقت ہوں وجاہت ہوں
اگر سر ہے تمھارے پاس تو دستار بھی ہوں میں
کبھی بیٹی کبھی بیوی کبھی سردار بھی ہوں میں
یہ مانو یا نہ مانو واقفِ گفتار بھی ہوں میں
اگر ہے چشمِ بینا تو دعا ہوں پیار بھی ہوں میں
نہیں تم بے بصر تو صاحبِ کردار بھی ہوں میں
میری غیرت کو للکارو گے تو تلوار بھی ہوں میں
نہیں ممکن میرے شفاف آنچل کو ہوا دینا
نہیں ممکن میرے دامن پہ داغوں کو سجا دینا
نہیں ممکن میری توقیر داؤ پر لگا دینا
نہیں ممکن مجھے زنجیر پہنا کر بٹھا دینا

نہیں ممکن لگا کر زخم جینے کی سزا دینا
نہیں ممکن ہے ناممکن کو ممکن سے ملا دینا
میرے معصوم بھائی میرے بچے آج یہ سن لیں
میں پابندِ سلاسل ہو کے بھی نگران ہوں سب کی
میں عورت کل بھی تھی میں آج بھی عورت ہوں ممتا ہوں
گواہی دے گا مرا کل مرے ہونے کی تم سب کو

قطعات

تعبیر ڈھونڈ لی ہے خوابوں کو کھو دیا ہے
منزل کی جستجو میں رستوں کو کھو دیا ہے
تجسیم کر لیا ہے میں نے حسیں تخیل
تحریر بن گئی ہے جذبوں کو کھو دیا ہے

دل مرا پھر سے ہے پاگل آج اک مدت کے بعد
آنکھ میں پھیلا ہے کاجل آج اک مدت کے بعد
ہوگیا ہے اب تو جاری بارشوں کا سلسلہ
چھٹ رہے ہیں کالے بادل آج اک مدت کے بعد

تلاشِ فصلِ گُل میں پتیاں سب نوچ ڈالی ہیں
ہوا میں سب ہی کچھ تحریر ہے پر ہاتھ خالی ہیں

غمِ ہجراں

O

کسی کی چنری میں دھوپ باندھی کسی کو وجہء جمال رکھا
کسی کے دامن میں صبح ٹانکی کسی کو شب کی مثال رکھا

رضا پہ تیری ہوئی میں راضی مگر مجھے آج یہ بتا دے
جواب سارے دیئے کسی کو مرے لئے کیوں سوال رکھا

تمنا دیدار کی مجھے تھی میں قریہ قریہ بھٹک رہی ہوں
عیاں ہوا تو سبھی پہ لیکن چھپا کے مجھ سے جمال رکھا

جہاں کے تخلیق کار تو نے یہ کیا کیا ہے یہ کیوں کیا ہے
بنا کے انساں کو سب سے افضل اسی کو روبہ زوال رکھا

یہ فیصلہ تیرا فیصلہ ہے مجال کس کی کہ اسکو بدلے
کسی کے دل میں ہوا چراغاں کسی کے رُخ پر ملال رکھا

وہ تیرا اپنا تھا میں نے مانا میں تیری کچھ بھی نہیں تھی جاناں
بچھڑنا تقدیر میں مری تھا نصیب اسکا وصال رکھا

فراق کی شب چمکتی یادوں کے جگنوؤں سے میں پوچھتی ہوں
مرے لیئے کیوں نہ چاہتوں کا چراغ کوئی سنبھال رکھا

O

مری زندگی ہے بھنور بھنور مجھے ساحلوں کی نہیں خبر
ترے فیصلے پہ مری نظر نہیں کچھ لکھا مرے ہاتھ میں

مری چاہتوں کو خراج دے مجھے کل نہیں مجھے آج دے
نہ کرے گی کوئی دوا اثر مرے زخم رسنے لگے اگر

میں جنونِ عشق میں ہوں رواں مجھے مل سکا نہ کوئی نشاں
ہے تلاش میری بھی خوب تر ہوں عطا مجھے مرے بال و پر

مرا سائباں مرا ساربان نہ بدل سکا رُخِ کارواں
وہ بچھڑ گیا سرِ رہگذر ابھی اور باقی تھا کچھ سفر

کوئی جان و دل سے قریب ہے صفِ دوستاں بھی نصیب ہے
کیوں بھٹک رہی ہوں ادھر اُدھر مجھے مل گیا درِ معتبر

مرے عشقِ خام کو نام دے مری کاوشوں کو دوام دے
مجھے منزلوں سے قریب کر ہوں مسافتیں میری مختصر

مری ذات میں رہا اک خلاء مجھے تو نے خود سے رکھا جدا
ہوں تری تلاش میں دربدر نہ نظر چرا مرے چارہ گر

O

خموش جھیل میں کنکر وہ پھینکتا بھی نہیں
سکوت ایسا ہے طاری کہ ٹوٹتا بھی نہیں

نہ شہرِ دل میں رکا اور نہ میرے ساتھ رہا
پکار سن کے مری وہ کبھی مڑا بھی نہیں

بکھرنے ٹوٹنے دیتا نہیں حوادث میں
حوالے ذات کے اپنے سمیٹتا بھی نہیں

وجود ہے کوئی سایہ ہے یا تخیل ہے
وہ دور دور ہے مجھ سے مگر جدا بھی نہیں

بھٹکتی رہتی ہوں اکثر غلام گردش میں
کسی بھی موڑ پہ وہ آج تک ملا بھی نہیں

وہ اجنبی ہے شناسا ہے جانے کون ہے وہ
مجھے تلاش ہے جسکی اُسے پتا بھی نہیں

انوکھا اُسکا تجاہل عجب تغافل ہے
مناتا مجھ کو نہیں مجھ سے روٹھتا بھی نہیں

ارادہ کیا تھا مسافر کا کچھ نہیں معلوم
سفر پہ جانے سے پہلے مجھے ملا بھی نہیں

کیوں ہم کلام ہے شہناز اک تخیل سے
جو دیکھتا ہے نہ سنتا ہے بولتا بھی نہیں

O

چھین لی وقت نے دیرینہ رفاقت میری
دربدر مجھ کو کیئے رکھتی ہے وحشت میری

آگے بڑھتی ہی نہیں ہوں کبھی اس خوف سے میں
مجھ کو مجھ سے ہی جدا کردے نا شہرت میری

تو نے جاتے ہوئے اک بار تو سوچا ہوگا
ہمسفر تیری رفاقت تھی ضرورت میری

تیری آواز نہ اب مجھ کو سنائی دے گی
اے خدا چھین لے اب مجھ سے سماعت میری

کس جگہ جا کے چھپا ہے یہ بتا دے مجھ کو
ڈھونڈ کر کیوں نہیں لاتی تجھے چاہت میری

O

ہٹا دو آیئنے آنکھوں کی حیرانی نہیں جاتی
خود اپنی شکل بھی اب مجھ سے پہچانی نہیں جاتی

جو سرتاپا محبت تھے جدا وہ ہوگئے جب سے
سکوں دل کو نہیں ملتا پریشانی نہیں جاتی

کسی بھی حرف کے پیکر سے غم خانہ نہیں سجتا
تمہارے بعد شہرِ دل کی ویرانی نہیں جاتی

غمِ تازہ چھپانے کو نیا چہرہ سجا کر بھی
بصد کاوش نمودِ سوزِ پنہائی نہیں جاتی

فراق و ہجر میں شہناز ہوتا ہے کبھی ایسا
کوئی آنسو نہیں بہتا پہ طغیانی نہیں جاتی

O

اے جنوں خیز محبت ترا سودا دیکھوں
گردشِ وقت باندازِ تماشا دیکھوں

پوچھتی پھرتی ہوں میں تیرا ٹھکانہ سب سے
اجنبی شہر میں کیسے تجھے ٹھہرا دیکھوں

چشمِ پرنم کے جھروکوں میں چھپالوں نا تجھے
اپنے سے دور تجھے کیسے میں بیٹھا دیکھوں

ہے کٹھن راستہ بینائی بھی مدھم مدھم
جلتے سورج کے تلے شب کا اندھیرا دیکھوں

ساتھ رہنا ترے عادت سی رہی ہے مری
بن ترے خود کو بتا کیسے میں تنہا دیکھوں

ایک پل رہ نہ سکی دور ستم کیسا ہے
تیری آواز سنوں نہ ترا چہرہ دیکھوں

میں جدائی کے تصور سے لرز جاتی تھی
ایسا کب سوچا تھا ایسے تجھے جاتا دیکھوں

O

وقت ظالم کو زمانے نے مسیحا سمجھا
اور ہر اک درد کا اسکو ہی مداوہ سمجھا

اہلِ دانش نہ کوئی عالم و دانا سمجھا
بات سمجھا تو مری صرف دوانہ سمجھا

اپنوں کو غیر کہا غیر کو اپنا سمجھا
ہم جہاں بیٹھ گئے اسکو ہی ڈیرہ سمجھا

بیچ منجدھار میں چھوڑا ہے اکیلا تو نے
ہمسفر ساتھ مرا تو نے پرانا سمجھا

اُسکے ہاتھوں میں تھمادی گئی ڈوری شہناز
جس نے جیون کو مرے صرف تماشا سمجھا

O

کاتبِ وقت یہ منشور نہ لکھا جاتا
حوصلہ مند کو مجبور نہ لکھا جاتا

وقت سرکش ہی ذرا اپنی طنابیں کستا
جو تھا نزدیک اسے دور نہ لکھا جاتا

گردشِ شام و سحرا یسے ہی جاری رہتی
ہجر کا دن غمِ دیجور نہ لکھا جاتا

دل کی بستی میں ترے دم سے چراغاں رہتا
چشم پرنور کو بے نور نہ لکھا جاتا

سُرخ پلو میں دھنک ہاتھ میں گجرے رہتے
زرد موسم دلِ رنجور نہ لکھا جاتا

تخت سلطان اُجڑتا نہ بچھڑتے ہم لوگ
شاہ کی ناز کو مزدور نہ لکھا جاتا

O

صلیب وقت نے ایسے چنا سزا کے لئے
میں ہاتھ تک بھی اُٹھا پائی نہ دعا کے لئے

نگل نہ جائے کہیں آج گہرا سناٹا
کوئی تو بات کرو آج تم خدا کے لئے

ہے تار تار تیری یاد کا حسیں ملبوس
کہاں سے لاؤں رفو گر پھٹی قبا کے لئے

کسی نے میری گواہی میں لب نہیں کھولے
کڑی ہے کتنی سزا جرمِ بے خطا کے لئے

پکارو پھر ذرا شاہ ناز کہہ کے آج مجھے
ہوں منتظر میں ابھی تک اُسی صدا کے لئے

O

حبس گھٹ جائے ذرا میں نے یہ مانگی تھی دعا
ٹوٹ کر یوں ہوئی برسات کہ گھر ڈوب گیا

ہوں کہاں کیسی ہوں کچھ بھی نہ مجھے یاد رہا
مجھ کو خود سے بھی ملے ایک زمانہ گذرا

قیدِ تنہائی غمِ ہجر مقدر ٹھہرا
اے خدا اتنی سزا اتنی سزا اتنی سزا

بعد تیرے مرا خود سے بھی تعلق نہ رہا
نہ کوئی حرفِ تمنا نہ کوئی لب پہ دُعا

ایک سیلاب بلا خیز تھا روکے نہ رُکا
بند سب ٹوٹ گئے چڑھ گیا اتنا دریا

ایک دوجے کے بنا وقت کٹے گا اپنا
نہ کبھی اُس نے کہا اور نہ میں نے سوچا

O

داستاں اپنی سناتے تمھیں مہماں کرتے
ذکرِ جاناں غمِ دوراں غمِ ہجراں کرتے

کوئی آتا ہی نہیں ہے مرے غم خانے تک
دل کے بہلانے کو کیا شامِ غریباں کرتے

وقت گذرا ہے یونہی گوشۂ دل کو اپنے
اُس کی یادوں سے سجاتے کبھی ویراں کرتے

پوچھتے حال ہمارا . جو کبھی وہ آکر
چشمِ گریہ کو سجا دعوتِ مژگاں کرتے

آبلے پیاس بجھانے کے لیئے کافی تھے
گر کہیں تھوڑا کرم خارِ مغیلاں کرتے

دو گھڑی کو ہی چلے آتے تسلی دینے
درد جو بخشا تھا اُس درد کا درماں کرتے

بیتی صدیوں کی تھکن پل میں اُتر جاتی اگر
زندگی ساتھ بسر وہ کسی عنواں کرتے

O

طوفاں سے نکلنے میں ذرا دیر لگے گی
کشتی کو سنبھلنے میں ذرا دیر لگے گی

بدلی سے پرے چاند مرا ڈوب گیا ہے
منظر کے بدلنے میں ذرا دیر لگے گی

دکھ درد وچھوڑے کا سنبھلنے نہیں دیتا
اب دل کے بہلنے میں ذرا دیر لگے گی

ظلمتِ شبِ دیجور کی چھَٹ جائے گی لیکن
سورج کے نکلنے میں ذرا دیر لگے گی

گردش نے تو نقشہ ہی بدل ڈالا ہے شہناز
محور کے بدلنے میں ذرا دیر لگے گی

O

سلگتی ذات کے منظر کو اب بدلنا ہے
اُداس شام کے لمحوں میں رنگ بھرنا ہے

سکت سفر کی تو باقی نہیں ہے تیرے بعد
بس اب تو صرف سفر کو تمام کرنا ہے

خزاں ہے نوحہ کناں فصلِ گُل پریشاں ہے
بدلتی رُت یہ بتا اب کہاں ٹھہرنا ہے

جنازہ اپنے ہی کندھوں پہ لاد کر شہناز
کبھی بھی شہر خموشاں میں جا اُترنا ہے

O

وہ لوٹا ہی نہیں شاید سفر سے
کوئی گذرا نہیں اس رہگذر سے

تھکے دن کی طرح میں بھی تھکی ہوں
مجھے لینا ہے کیا شام وسحر سے

یہ چھالے پاؤں کے بتلا رہے ہیں
ابھی تک دور ہوں میں اپنے گھر سے

نئے منظر بھی اب بنتے نہیں ہیں
نظر آتا نہیں کچھ چشمِ تر سے

تلاش سمت میں بھٹکی ہوئی ہوں
مجھے رستہ دکھا کہہ دے خضر سے

میں پابندِ مکاں رہنا نہ چاہوں
عجب اک خوف سا ہے بام دور سے

ٹھکانا مجھ کو مشکل سے ملا ہے
کہیں جاتی نہیں کھونے کے ڈر سے

بہارو پیرہن اس کا بدل دو
پرندے چہچہائیں اس شجر پہ

لئے سب ہاتھ میں پتھر کھڑے ہیں
نکل شہناز اب شیشے کے گھر سے

O

منزل کوئی ملی نہ کوئی نا خدا ملا
کیوں اس سفر نصیب کو رستہ جدا ملا

اس پار جا اترنے کی خواہش کبھی جو کی
ہر پل ہی درمیان سے ٹوٹا ہوا ملا

مدت کے بعد لوٹ کر آئے جو شہر میں
دیرینہ دوستوں کا بھی چہرہ نیا ملا

ہم رازداں کسی کو بناتے تو کس طرح
ہر شخص اپنی ذات کے اندر چھپا ملا

ہر لمحہ ریزہ ریزہ بکھرتی رہی ہوں میں
یکجا جو کر سکے نہ کبھی وہ خدا ملا

شہناز تو گمان کی حد میں ٹھہر گئی
ہر سمت سے یقین بھنور میں گھرا ملا

O

جو تھے منزلوں کے فراق میں سبھی راستے وہ مٹا دیئے
سرِ شام ہی جو بھڑک اُٹھے وہ الاؤ میں نے بجھا دیئے

میں فریبِ وقت میں قید تھی رُخِ کارواں نہ بدل سکی
کڑی دھوپ میں جو ملے شجر تو وہیں پہ ڈیرے جما دیئے

تھا عجیب میرا بھی ناخدا اُسے آزمانا تھا حوصلہ
مجھے ظلمتوں کے سپرد کر کے چراغ سارے بڑھا دیئے

نہ ملا مجھے کوئی نقشِ پا نہ وصال کا ہی سبب بنا
مرے ریزہ ریزہ سے خواب تھے شبِ نارسا میں جلا دیئے

لئے ہاتھ میں وہ کٹے شجر رہے منتظر کہ ملے ثمر
نظر آئے اُن کو نہ بال و پر جو تھے گھونسلوں میں دبا دیئے

یہ ترا کرم ہے مرے خدا وہ نظر ہوئی ہے مجھے عطا
صفِ دوستاں میں چھپے ہوئے رُخِ دوستاں بھی دکھا دیئے

کبھی سرد سر دسی دھوپ تھی کبھی تھی تپش جمی برف میں
نئے موسموں کے مزاج نے سبھی رُخ فضا کے دکھا دیئے

مجھے واہموں نے ڈسا کبھی کبھی چیختی رہیں خواہشیں
میں جو مبتلائے فریب تھی سرِ دار سپنے سبھی سی دیئے

نہ سمندروں سا مزاج تھا نہ فضاؤں جیسی تھیں وسعتیں
تو ہوا کے رُخ پہ چراغ کیوں شبِ تار سارے جلا دیئے

O

چراغِ دل جلانے میں بہت ہی دیر کردی ہے
سراغِ درد پانے میں بہت ہی دیر کردی ہے

حریرو پرنیاں خوشبو جڑاؤ ہاتھ کے کنگن
گل ولالہ سجانے میں بہت ہی دیر کردی ہے

کہیں پتھر نہ ہوجائیں مری یہ منتظر آنکھیں
پلٹ کر تم نے آنے میں بہت ہی دیر کردی ہے

چلو کچھ مختصر کردیں غم وآلام کا قصہ
تمھیں ہم نے بھلانے میں بہت ہی دیر کردی ہے

جنون بے باک نے ساری حدوں کو توڑ ڈالا ہے
خرد نے مات کھانے میں بہت ہی دیر کر دی ہے

نمو کی رُت بہت مدت سے تاریکی میں ٹھہری ہے
نئے سورج نے آنے میں بہت ہی دیر کر دی ہے

نظمیں

حصار آئینہ خانہ

ستارے گُل نہیں ہوتے
ستارے ڈوب جاتے ہیں
مقدر جو نہیں بنتے
وہ تارے ٹوٹ جاتے ہیں
ہوائے شب گریزاں ہے
عجب سا حبس موسم ہے
حصارِ آئینہ خانہ
لگا ہے ٹوٹنے جاناں
سبھی منظر بدلتے ہیں
مرا منظر بھی اب بدلے

انا کی چیخ

منڈیریں یاد کی سونی پڑی ہیں
ستارے آنکھ میں ٹھہرے ہوئے ہیں
شفق آلود شامیں مضطرب ہیں
چراغاں کب شبِ ہجراں میں ہوگا
مری آنکھوں میں منظر جاگتے ہیں
میں پھر پلکوں کو اپنی سی رہی ہوں
بہت سے بے یقیں لمحوں میں کھو کر
میں بے بس ہو کر کیسے جی رہی ہوں
غبار آلود ساری خواہشیں ہیں
انا کی چیخ دب کر رہ گئی ہے
کھرچ دوں لوحِ دل سے نقش سارے
حصارِ راہ تری چاہتیں ہیں

قطعات

کبھی گذرے ہوئے لمحوں سے رشتہ جوڑ کر دیکھو
کبھی دہلیز پر تم اپنی آنکھیں چھوڑ کر دیکھو
حقیقتِ ضبط کی کھل جائے گی بس ایک ہی پل میں
کوئی مضبوط ناطہ راستے میں توڑ کر دیکھو

سلسلہ جوڑا تھا کب اس نے محبت کے لئے
کھیل ہی کھیلا گیا صرف شرارت کے لئے
میں نے توڑا ہے تعلق تو شکایت کیسی
رابطہ اس نے کیا کب تھا وضاحت کے لئے

شہناز مزمّل ایک متحرک شاعرہ

شہناز مزمّل کو میں نے پہلی بار ایم اے او کالج کے ایک مشاعرے میں سنا تھا۔ اس مشاعرے میں حاضرین نے نہایت دلچسپی سے ان کا کلام سنا تھا۔ تب مجھے ایک نئی آواز اور ایک معتبر آواز سے آگاہی ہوئی۔ شہناز مزمّل سے میری ملاقاتیں اکثر مشاعروں اور ادبی محافل میں ہوتی رہیں علاوہ ازیں ملک کے اخبارات اور جرائد میں بھی ان کے کلام سے مستفید ہونے کے مواقع ملے۔ شہناز مزمّل ایک علیحدہ ہی اپنا اندازِ شعر رکھتی ہیں۔ نہایت خوبصورت اور باوقار لہجہ میں شعر کہتی ہیں۔ وہ اپنے پہلو میں جذبات سے بھرپور دل رکھتی ہیں اور خاص انداز میں ذاتی ہجر ووصال کے علاوہ اپنے کرب۔ جلن اور وچھوڑے کی باتیں بھی کرتی ہیں۔ میں نے تو دیکھا کہ ان کی شاعری کا رخ عشق حقیقی کی جانب مڑتا جارہا ہے۔ بہر حال یہ بھی عشق کی ایک منزل ہے۔ اور ایسا آدمی ولیوں۔ پیروں اور فقیروں کا مرتبہ پاتا ہے۔

شہناز مزمّل کی 14 علمی وادبی کتب چھپ چکی ہیں۔ اب تازہ شعری مجموعہ بعنوان ''عشق تماشا'' زیر نظر ہے جس کا مطالعہ یقیناً ہمیں ان کے نئے مقام فکر وفلسفہ سے روشناس کرائے گا۔ شہناز مزمّل علم وادب اور شعر وشاعری کی دنیا میں فعال اور متحرک شاعرہ دکھائی دے رہی ہیں۔ کتب کی نشر واشاعت کے علاوہ ہر ماہ ایک مشاعرہ اپنے دولت کدے پر منعقد کرواتی ہیں۔ شہناز مزمّل دراصل ایک متحرک شاعرہ ہیں دوسری ہم عصر شاعرات کی طرح شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر شاعری ختم نہیں کی۔ دوسری شاعرات نے شاعری کا نام لیکر اپنے آپ کو چمکایا اور شہرت حاصل کی لیکن وہ غیر متحرک ہو کر رہ گئی ہیں بلکہ دوسرے علوم کی طرف نکل گئی ہیں۔ انھوں نے دوسری فیلڈ چن لی ہے۔ کشور ناہید ایک شاعرہ ہیں لیکن آجکل کوئی شعری تخلیق نہیں ہورہی۔ وہ چند اخباری کالموں اور ادھر ادھر کے دوروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔

اس طرح زہرہ نگاہ اپنے وقت کی نامور شاعرہ ہیں لیکن خدا جانے کس دنیا میں جا کر کھوگئی ہیں۔حالانکہ شاعری کی وجہ سے وہ جانی پہچانی جاتی ہیں۔پھران کی شاعری کی تحریک کیوں معدوم ہوکررہ گئی ہے۔انصاف کی بات یہ ہے کہ ایسی شاعرات ادب کی کوئی خدمت نہیں کرتیں۔ بلکہ چاند بن کر چمکتی ہیں اور چھپ جاتی ہیں لوگ ان کی چاندنی سے محروم ہی رہتے ہیں۔

کچھ شاعرات میں جو عملی طور پر شاعری تخلیق کررہی ہیں اوران کا نام زندہ رہے گا۔مثلاً ادا جعفری۔شبنم شکیل۔نوشی گیلانی۔ثمینہ راجا۔رخشندہ نوید۔نیلما سرور۔پروین شاکراور شہناز مزمّل وغیرہ۔اس حوالے سے یہ عرض کرتا چلوں کہ پاکستان میں خواتین کے شعری کاموں پر پی ایچ ڈی تھسز ڈاکٹر خورشید رضوی کی نگرانی میں یقیناً یہاں متحرک شاعرات کی تخلیقات سامنے آئیں گی۔

شہناز مزمّل ایسی شاعرہ ہیں جو شعروادب کیلئے متحرک ہوئی ہیں۔ان کی شاعری قد آور تحریک بنتی جارہی ہے۔وہ قفِ شاعری کو کمال پر پہچانا اپنا ایمان کامل سمجھتی ہیں۔وہ نہایت ذمہ داری سے شعر کہتی ہیں اوراپنے دکھ،درداور کرب بڑے سلیقے سے بیان کرتی ہیں۔وہ شعر کی مالا میں خوبصورت الفاظ کے موتی پروتی ہیں۔

شہناز مزمّل غزل میں اپنے اظہار کے لئے ایسے خوبصورت استعارے استعمال کرتی ہیں جن سے شعر کی قیمت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔مثلاً دھوپ۔موم اور پتھر کے استعارے یوں بیان کرتی ہیں۔

دھوپ کی بستی میں پتھر کا بناتی سائباں
موم سے ترشا ہوا شہناز گھر بے کار تھا

یا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

کسی کی چنری میں دھوپ باندھی کسی کو وجہء جمال رکھا
کسی کے دامن میں صبح ٹانکی کسی کو شب کی مثال رکھا

شہناز مزمّل صنف غزل میں ایک خاص اسلوب رکھتی ہیں۔ وہ اپنی نسوانی آواز کو نہایت سلیقے سے شعر میں برتتی ہیں۔ ان کے خیالات واحساسات کے سمندر کی لہریں دیدنی ہوتی ہیں۔ انکی اپنی ایک لہر ہوتی ہے اپنا برتاؤ ہوتا ہے اور اپنا ایک خیال ہوتا ہے۔ مثلاً غالب دنیا کو بازیچہ اطفال سمجھتے ہیں اور وہ تماشا بنتے نہیں ہے بلکہ ہوشمند ہیں اور دنیا کا تماشا دیکھتے ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب وروز تماشا مرے آگے

لیکن اس کے برعکس شہناز مزمّل وہ عشق کے مقام سے پرے نکل گئی ہیں۔ اور ہوش کی قید سے آزاد ہو کر دنیا کو دیکھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔

اپنے آپ میں کھونے دے اب
عشق تماشا ہونے دے اب

یہ مقام مقدس تو کسی ولی کو ملتا ہے۔ وہ دنیا سے بے نیاز ہو کر حقیقت عشق کو سمجھ لیتا ہے۔

نثار اکبر آبادی۔ لاہور

14-01-2001

PH: 042-7116848

ادبی سفر شہناز مزمّل

شاعری:

پیامِ نو

جُراتِ اظہار

جذب و حروف

عکس دیوار پہ تصویر

موم کے سائباں

Ten Peots of today

میرے خواب ادھورے ہیں

جادۂ عرفاں

عشق تماشا

غمِ ادراک۔ زیرِ طبع

نثری کتب

فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار

لائبریریوں کا شہر لاہور

نماز (بچوں کے لئے)

عکسِ خیال، شہناز مزمّل ایک تعارف

اُجلا کون میلا کون کالموں کا مجموعہ۔ زیرِ طبع



اپنے آپ میں کھونے دے اب
عشق تماشا ہونے دے اب